مسئلۂ توحید

نعمان نیئر کلاچوی

مسئلہِ توحید

نعمان نیئر کلاچوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام مقالہ	مسئلہِ توحید
مصنف	نعمان نیرؔ کلاچوی
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان
پی ڈی ایف ایڈیشن	جون،2024

☆☆☆☆☆

انسان کا اعجاز شعور ہے اور کمال منطق۔ ارسطو نے ایک سماجی حیوان (انسان) کو حیوانِ ناطق یعنی Intellectual Human بنا دیا۔ شعور تو کمال ہے خدائے خیر کا لیکن شعور کو منظم کر کے چند آفاقی اُصولوں کے تابع کرنا یہ کمال ٹھہرا انسان کا۔ گویا ہم انسان خیر کے دائرے میں خدائے خیر کے بہت جائز جانشین ہیں۔ پھر مسئلہ اُس وقت خراب ہوتا ہے جب ہم خدائے شر کے تابع ہونے لگتے ہیں۔ اب آپ سوچ رہے ہوں کہ ایک ہی اثناء میں مَیں نے دو خدا کیسے پیدا کر لئے حالانکہ خدا قادر تو صرف ایک ہی ہے۔ خدا قادر صرف ایک ہی ہے جیسے انتہائی اہم اور بظاہر عام مسئلے کو سمجھنے کیلئے ہی میں یہ الفاظ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

چنانچہ کچھ بھی عرض کرنے سے قبل میں اپنی فکری پوزیشن واضح کر دوں کہ نہ تو میں عام معنوں میں مذہبی ہوں اور نہ ہی خاص معنوں میں ملحد یا دہریہ۔ میرا اقیام (Stance) اب تک محض ایک محقق طالبعلم کی حیثیت رہا ہے اور میں منطق اور کلام کی بنیاد پر مذہب اور اِلحاد و دہریت پر مدلل تنقید کرتا رہتا ہوں اور اِس سارے معاملے میں میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی لمحے میرا ذاتی رجحان یا طبعی میلان میرے الفاظ کے بیچ نہ آسکے۔

بنیادی طور پر میں ہر قسم کی نفرت اور تعصب سے خود کو الگ رکھتا ہوں۔ تمام انسان بشمول چرند پرند سبھی جاندار نہ صرف محترم ہیں بلکہ اِس کائنات میں سبھی کو اپنی جبلت اور اپنے شعوری ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ میرے نزدیک خیر اور شر جیسی انسانی اقدار موجود تو ہیں مگر مطلق (Absolute) نہیں یعنی یہ ہمیشہ اضافی (Relative) ہی رہے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانے اور ایک وقت کی خیر دوسرے زمانے میں خیر نہیں رہتی بالکل ایسے ہی ایک وقت کا شر دوسرے کسی زمانے یا وقت میں شر نہیں رہتا۔ چنانچہ انسان اگر صرف اِسی ایک نکتہ کو سمجھ تو لے تو دنیا میں اَمن ہو جائے۔ خیر یعنی کیا؟۔ عدل کی عملی صورت خیر ہے اور شر یعنی ظلم کی عملی صورت کو شر کہا جا سکتا ہے۔

آپ غور کریں اور زیادہ گہرائی میں بھی نہ جائیں اور صرف ایک اُڑتی ہوئی نظر ڈالیں لیں تو یہ پوری کائنات اور انسان اِسی خیر و شر کی کشمکشِ اعلیٰ (The Grand Dilemma) کے بیچ جھول رہی ہے۔ جب یہاں تک پہنچ جائیں تو پھر سے نظر دوڑائیں کہ کیا اِن دو کے بیچ میں یا اِن سے

ماوراء (Beyond) بھی کچھ موجود ہے یا نہیں؟۔ قطعاً نہیں۔ آپ بھلے بار بار غور کرلیں۔ اِس کشمکشِ اعلیٰ کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

بس اب یہ شعوری مجبوری ہو گئی کہ انسان اِسی کشمکشِ اعلیٰ کی بنیاد پر شناخت کا معیار قائم کرے۔ شناخت کا قانون یعنی The Law of Identity۔ یہ منطق یا کلام کا پہلا اُصول ٹھہرا۔ اِس سے تھوڑا آگے جائیں تو سمجھنے کی غرض سے ہم یہ کہیں گے کہ جب خیر واقع ہوتی ہے تو شر معدوم ہو جاتا ہے اور جب شر واقع ہوتا ہے تو خیر معدوم ہو جاتی ہے۔ پس ایک وقت میں صرف ایک قدر واقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آفاقی تفریق کا یہ اٹل قانون یعنی The Law of Non-Contradiction منطق یا کلام کا دوسرا اُصول ٹھہرا۔

اب تیسرا نہایت اہم اِمکان یہ کہ کیا اِس کائنات یا انسان میں کچھ ایسا بھی ہے کہ جو اِس کشمکشِ اعلیٰ کے درمیان میں واقع ہو۔ یعنی کچھ خیر مع کچھ شر۔ قطعاً نہیں۔ چنانچہ جب خیر واقع ہوتی ہے تو وہ کماحقہٗ خیر ہوتی ہے اُس میں سے کچھ حصہ شر کا نہیں ہوتا اِسی طرح جب شر واقع ہوتا ہے تو وہ کماحقہٗ شر ہوتا ہے اُس میں کچھ حصہ خیر کا نہیں ہوتا۔ سادہ الفاظ میں جب عدل واقع ہو جاتا

ہے تو ظلم اپنے آپ معدوم ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی ظلم کے وقوع پر خیر معدوم رہتا ہے۔ ہم اِس کشمکشِ اعلیٰ کے نہ تو بیچ میں رہ سکتے ہیں اور نہ ہی اِن سے ماوراء ہو سکتے ہیں۔ اب اِسی درمیانی مقام سے کُلی نجات کا قانون یعنی The Law of Excluded Middle منطق یا کلام کا تیسرا اور آخری اُصول ٹھہرا۔ اب ہم تسلی سے بات کر سکتے ہیں کیونکہ اب بات کرنے کے مستقل اُصول ہمارے ہاتھ لگ گئے ہیں۔

یہاں پر ایک اُڑتا اُڑتا سوال یہ بھی ذہن میں آرہا ہے کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ ہم اِنہی مندرجہ بالا اُصولوں کی اطاعت کریں؟۔ اِس سوال کا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر ہم اِن اُصولوں کی اطاعت نہیں کرتے تو فہم یعنی انسانی شعور کا اِطلاقی عمل پوری طرح غارت ہو جاتا ہے۔ مطلب کیسے؟۔ غور کریں۔ مثلاً اگر ہم انسانی اعمال اور پوری کائنات پر بار بار غور کریں تو ہمیں خیر اور شر کے علاوہ تیسری قدر کہیں بھی نہیں نظر نہیں آتی۔ آپ قدر کی جگہ قوت کہہ لیں۔ تحریک کہہ لیں۔ کائناتی اُصول کہہ لیں۔ فطرت کا مظہر کہہ لیں۔ توانائی کہہ لیں۔ کسی بھی نام سے موسوم کر لیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چنانچہ جب ہمیں کوئی تیسری قدر ہی نہیں نظر نہیں آتی تو ہم کس بنیاد پر فہم حاصل کریں گے کہ تیسری قدر تو یہ ہے۔ وہ ہے۔ یہ ایک ایسی شدید مجبوری ہے کہ ہم فرض بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ہم فرض بھی کرتے ہیں تو پھر بھی اِنہی دو اقدار سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یعنی اگر ہم کہہ دیں کہ فلاں عمل نہ تو خیر ہے اور نہ ہی شر تو تیسری صورت مجبوراً یہ بنتی ہے کہ پھر کہہ دیں کہ مذکورہ عمل تھوڑا خیر تھوڑا شر بنے گا۔ مطلب ایسی شدید مجبوری میں بھی ہم خیر اور شر کے علاوہ کوئی نئی قدر نہیں پیدا کر سکے۔ غور کریں۔

اب تھوڑی دیر کیلئے ہم خیر اور شر کے علاوہ کچھ ڈھونڈیں تو ہمیں بار بار نظر دوڑانے پر بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ نظر قریب ہو یا بہت دور بہرحال خیر اور شر کے علاوہ کوئی تیسری صورت نظر نہیں آتی۔ بات صاف ہو گئی کہ پہلی صورت میں ہمیں کسی بھی چیز کی شناخت کیلئے اُسے خیر یا شر کی صفات ہی سے منسوب کرنا پڑے گا اور یہی شناخت اُس چیز کا جوہر بن جائے گی۔

دوسری صورت میں ہمیں اِس اُصول کی پابندی کرنا ہو گی کہ کوئی بھی چیز یا خیال ایک ہی وقت میں خیر یا شر میں سے کسی ایک سے منسوب ہو ورنہ فہم

غارت ہو جائے گا نہ صرف فہم غارت ہو جائے گا بلکہ اعتبار جسے مذہبی اصطلاح میں عقیدہ سیاسی اصطلاح میں قانون اور علمی اصطلاح میں اُصول کہتے ہیں قائم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً کسی شخص کو اگر بیک وقت سچا اور جھوٹا مان لیا جائے تو پھر اُس کی شناخت کس اُصول پر قائم کی جائے کہ وہ سچا ہے یا پھر جھوٹا؟، اور پھر کیسے اعتبار کیا جائے گا کہ وہ اِس وقت جو کچھ بول رہا ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ؟۔ اب اِس وضاحت سے منطق کا تیسرا اور آخری بنیادی اُصول بھی اپنے آپ ہی سمجھ آجاتا ہے کہ مذکورہ دو صفات کے درمیان میں کوئی قیام نہیں ہے۔ کلام کے بنیادی اُصول واضح ہو جانے کے بعد اب ہم مسئلہِ توحید پر بات کرتے ہیں۔

توحید ایک خاص مذہبی یا دینی اصطلاح ہے۔ اس کا سادہ مطلب اگر ہم سمجھنا چاہیں یا جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس سے مراد ہے دراصل خدا واحد پر ایمان رکھنا۔ خدا واحد بیک وقت تمام کائنات بشمول تمام جانداروں کا ایک اکلوتا خالق اور مالک ہے۔ بیک وقت خالقِ خیر و شر ہے۔ قادرِ مطلق اور اپنی ذات میں کامل و غیر متبدل اور لاثانی ہے۔ خدا واحد و قادر مطلق کا یہ تصور دراصل دنیا کے نہایت عظیم اور معروف اَدیان کی دینی بنیاد ہے۔ جیسا کہ یہودیت،

مسیحیت، اسلام، اَدویت ویدانت، بہائیت، احمدیت، سکھ مت اور تصوف۔ یہودیت میں اِسے "ایلوہِم (Elohim)"، مسیحیت میں اِسے "God"، اسلام اور احمدیت میں اِسے "اللہ"، اَدویت ویدانت میں "ایشور"، بہائیت میں اِسے "قادر مطلق"، سکھ مت میں اِسے "اِک اُونکار" اور تصوف میں اِسے "ھُو" کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ میرے قارئین زیادہ تر اسلام سے وابستہ ہیں اِس لئے بہتر یہی ہے کہ ایک خدا کی تعریف ہم اسلامی متن سے دے دیں تو معقول رہے گا۔ قرآن کی سورہِ اخلاص واحد سورہ ہے جس میں ایک خدا کے متعلق بنیادی نوعیت کی معلومات ایک ساتھ مل جاتی ہیں۔ ہم پوری سورہ پھر اِس کا ترجمہ درج کر دیتے ہیں۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ﴿١﴾ اللَّهُ الصَّمَدُ ﴿٢﴾ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ﴿٣﴾ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴿٤﴾۔ کہو، وہ اللہ ہے، یکتا (1) اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اُس کے محتاج ہیں (2) نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد (3) اور کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے (4) (ترجمہ از سید ابو الاعلیٰ مودودی)۔ یہی اللہ ہر چیز کا خالق و محافظ بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔

(سورہ الزمر آیت 62 ترجمہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی) یہی اللہ شر کا بھی خالق ہے جیسا کہ خیر کا خالق ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ۔ ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے۔ (سورہ الفلق آیت 2 ترجمہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی)۔ خدا واحد کا یہ دینی خیال کیسے انسان نے سینچا اِس کی سرگزشت ملاحظہ فرمائیں۔

انبیاء کرامؑ کے تاریخی ریکارڈ سے قبل اگر کوئی شخص انسانی تاریخ میں باقاعدہ ذہین اور نیک سیرت مانا جاسکتا ہے تو وہ دراصل یونان کا حکیم افلاطون ہے۔ افلاطون جسے مغرب میں Plato کہا جاتا ہے حکیم یونانی جناب سقراط کا شاگردِ رشید تھا۔ سقراط یونان میں پہلا ذہین انسان تھا جس نے پہلی بار باقاعدہ سوال کا اِمکان ظاہر کرکے مکالمہ کی بنیاد رکھی۔ سقراط عموماً اپنے مخاطب سے سوالات کرتے کرتے اُسے وہاں تک لے آتا جہاں وہ خود کھڑا ہوتا۔ مکالمہ کا یہ خاص فن آج فلسفہ میں جدلیات (Dialects) کی اصطلاح سے معروف ہے۔

چنانچہ سقراط کے بعد آپ کا نیک شاگرد افلاطون حکمت کی دنیا میں آیا اور آپ نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر قدرِ خیر (Value of Good) کو

ایک لاثانی اور کامل متحرک کی حیثیت سے انسانی فہم میں جگہ دی۔ افلاطون اِسی خیر محض(The Good)کا مطیع و پرچارک رہاہے۔ اگر ہم افلاطون کی خیر محض کو خدائے خیر بھی کہہ دیں تو کوئی خلطِ مبحث پیدا نہیں ہوتا کیونکہ افلاطون کے نزدیک یہ خیر عمومی نہیں ہے بلکہ ہر لحاظ سے کامل و غیر متبدل اور لاثانی ہے۔ یہی خیر محض تمام تر علوم، سچائیوں اور اخلاقیات کا سر چشمہ ہے۔ گویا افلاطون کی خیر محض دراصل خدا واحد بشمول صفاتِ خیر ہی کا ایک سادہ تصور ہے۔ افلاطون کا خدائے خیر جب آپ کے نیک شاگرد ارسطو کے پاس پہنچا تو آپ نے اِس کا نام بدل کر غیر متحرک محرک (The Unmoved Mover)رکھ دیا۔ یہ غیر متحرک محرک اپنی اصل میں خیر محض کا حامل ہے اور کامل و یکتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کی واحد نیت پر مبنی یہ الہیاتی منطق دراصل توحید کا خام تصور ہے جو سب سے پہلے معلوم تاریخ میں یونان سے ہی ارتقاء پذیر ہوا۔ ارسطو کے بعد توحید کے اِس خام خیال کو باقاعدہ طور پر احدیت (Oneness) کی صورت دینے والے پہلے حکیم فلاطینوس (Plotinus) تھے جنہوں نے احدیت کے تصور کو باقاعدہ ایک منظم شکل دے کر کائنات میں اِس کی اطلاقیت پر

مُہر ثبت کر دی۔ فلاطینوس فکری لحاظ سے حکیم افلاطون کے خوشہ چین تھے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے افلاطون کے خیر محض کو ایک کامل و یکتا اور قادر مطلق خدا بنا دیا۔ فلاطینوس پہلا فلسفی ہے جس نے انسانی معاشرت کو توحید کا باقاعدہ فلسفیانہ تصور دیا۔ چنانچہ اِس سے قبل کا تاریخی ریکارڈ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اَدویت ویدانت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصور سب سے پرانا ہے لیکن اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اَدویت ویدانت کی تنظیمِ نو نوّیں صدی عیسوی میں آدی شنکر آچاریہ نے کی تو تاریخی لحاظ سے (Chronologically) اِس تصور کی تنظیم فلاطینوس کے بعد ہی شمار کی جائے گی۔ احدیت کے خیالی سفر کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد اب ضروری ہے کہ ہم براہِ راست اسلام کے تصورِ توحید پر بات کر لیں تا کہ اِس بحث کا معلوماتی حصہ مکمل ہو جائے۔

اسلام میں توحید کا شعور مسیحیت اور یہودیت کی وساطت سے پہنچا کہ اسلام اپنی اصل میں دینِ ابراہیم کا ہی تسلسل ہے اور ابراہیمی اَدیان میں اسلام سے قبل یہودیت اور مسیحیت کا شمار ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ

شَہِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔۔۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔۔۔ (سورہ الحج آیت 78 ترجمہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی)۔

توحید کا سادہ تصور جس میں کسی فلسفیانہ مباحث کی ضرورت نہ تھی بلاشبہ یہودیت اور مسیحیت ہی کا تسلسل ہے لیکن اِس تصور کو منطقی سہارا دینے کیلئے بعد میں مشائیت (Aristotelianism) کی ضرورت پڑ گئی۔ چنانچہ سب سے پہلا مسلم فلسفی یعقوب بن اسحاق الصباح الکندی جس نے ارسطو کی الٰہیات جو اصل میں فلاطینوس کی ہی الٰہیات تھیں کا ترجمہ پڑھا اور پھر خلیفہ المامون کی وساطت سے ایک بالکل جدید الٰہیات جسے اسلامی الٰہیات یا حکمتِ متعالیہ کہا جاسکتا ہے کی بنیاد رکھی۔

یہاں پر نہایت دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مسلم حکماء ایک زمانے تک جسے ارسطو کی الٰہیات یعنی Theology of Aristotle معرب بہ اَثولوجیا کہتے اور پڑھتے رہے وہ دراصل فلاطینوس کی Enneads کا چھٹا باب تھی۔ ارسطو اور فلاطینوس کے افکار کا ملغوبہ جسے عرب اَثولوجیا کہتے رہے

در حقیقت اسلامی الٰہیات کی نیو ہے۔ الکندی کے بعد اِس کتاب پر ایک اور فارسی نژاد مسلم فلسفی ابو نصر الفارابی اور پھر اِس کے بعد حکیم بو علی سینا نے غور کر کے اسلامی الٰہیات کو جدید منطق پر استوار کیا۔ یعنی جسے آج ہم اسلامی فلسفہ کہتے ہیں یہ دراصل أثولوجیا ہی کی کسی قدر شرح پر مبنی ایک فکر ہے۔ پس الکندی، الفارابی، اِبن سینا، ابن رشد، شہاب الدین سہروردی، مُلّا صدرا، ابن العربی اور عبدالکریم جیلی چند ایک ایسے نام ہیں جنہوں نے فلاطینوس کے تصورِ احدیت کو اسلامی توحید کی بنیاد بنایا۔ پس یہ نوفلاطونیت (Neoplatonism) ہے جو آج پوری طرح اسلام کے تصورِ توحید کی صورت میں ڈھل چکی ہے۔

توحید کا مذکورہ حصہ کسی قدر تمہیدی معلومات پر مبنی تھا تاکہ توحید پر تنقید کے موقع پر قارئین تصورِ توحید سے کسی قدر آگاہ رہیں۔ اِن تمہیدی معلومات میں بہت کچھ ایسا ہے جس کو اگر مفصل کر دیا جاتا تو ہم اپنے اصل موضوع سے بہت دور نکل جاتے اِس لئے میں نے کوشش کی بس ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو کافی ہے۔ یہ ہے اصل علمی مسئلہ جس کی جانب اب ہم آ رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک جملہ معترض ہو سکتا ہے کہ میں نے عقیدہ یا

تصورِ توحید کو مسئلہ کیوں کہا۔ تصورِ توحید کلام اور منطق کے دائرے میں چونکہ تاحال ایک مسئلہ ہے اِس لئے مجھے مجبوراً اِس تصور کو مسئلہ کہنا پڑا۔ غور کریں کہ فی الحقیقت ایسا کیوں ہے۔

ہم کلام کی مبادیات پڑھ آئے ہیں کہ کسی کلام میں وہ کونسے بنیادی اُصول ہیں جن کی اطاعت کر کے ہم جان سکتے ہیں کہ ہم منطقی لحاظ سے درست سَمت میں جارہے ہیں۔ آئیے ایک بار پھر سے وہ تین بنیادی اُصول دیکھ لیں۔

پہلا اُصول	Law of Identity شناخت
دوسرا اُصول	Law Non-Contradiction منہائیت از تضادِ داخلیہ
تیسرا اُصول	Law of Excluded Middle منہائیت از مابینیہ

توحید کا مقدمہ

اللہ یا آپ جس کسی بھی توحیدی اسم سے تعبیر کر لیں ایک ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ تمام موجودات کا پالنہار ہے۔ خالقِ کُلِ شئ یعنی خالقِ خیر و شر ہے۔ میرا مقصود چونکہ توحید کی شرح بیان کرنا نہیں ہے اِس لئے میں یہیں پر رُک کر اپنا اصل مدعا بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

واضح رہے کہ خدا کے وجود پر بحث میرا اصل موضوع نہیں ہے اِس لئے میں اِسے بائی پاس کرتے ہوئے خدا کی وحدانیت پر بحث سے آغاز کرتا ہوں۔ خدا کی شناخت وہ پہلا مرحلہ ہے جسے ہم خبر یا نقل کی وساطت سے طے کر آئے ہیں اور اب ہمارے سامنے مسئلہ ہے خدا کی یکتائیت کا یعنی خدا ایک ہے۔ خدا ایک ہے یعنی وہ خیر اور شر دونوں کا خالق ہے۔ اب یہ مقدمہ اپنی اصل میں منطق یا کلام کے متصادم ہو رہا ہے۔ یہ مقدمہ منطق کے دوسرے اُصول کے خلاف جارہا ہے جس کے تحت کوئی بھی وجود ایک وقت میں دو متضاد صفات کا حامل نہیں ہو سکتا۔ غور کریں کہ مسئلہِ توحید اب کلام کے دائرے میں ایک منطقی مغالطہ بن گیا۔ اب اگر ہم منطق کے دوسرے بنیادی اُصول کو بائی پاس کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو سب سے پہلے جو

نیا مسئلہ ہمارے لئے دردِ سر بنتا ہے وہ ہے دراصل عدمِ عدل کا یعنی Violation of Justice۔ چنانچہ اگر ہم ایک ایسا خدا تسلیم کر لیں جو بیک وقت خیر و شر کا خالق ہے تو عدل غارت ہو جاتا ہے۔ نہ صرف عدل غارت ہو جاتا ہے بلکہ تمام توحیدی مذاہب کا استدلال یعنی ضرورتِ ہدایت بھی لایعنی ہو جاتی ہے۔ شر کا خالق شر کے مواخذہ کا کیسے مستحق ٹھہرتا ہے یہ اعتراض بعد کی بات ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی مؤجد بیک وقت خیر اور شر کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا کیونکہ شر انسانی فہم کے دائرے میں ایک ظلم ہے اور ظلم کا خالق عدل کا مؤجد نہیں ہو سکتا۔ بالفرض مان لیں کہ ہو سکتا ہے تو پھر فوری طور پر ہمیں فہم سے دستبردار ہونا پڑے گا اور اگر فہم سے دستبردار ہو گئے تو بتائیے کسی فکر یا قدر کا اعتبار رہا؟۔ ع

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

ایسی صورت میں کون عادل ہے اور کون مظلوم۔ کون محتسب ہے اور کون جوابدہ۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ انسان فکری لحاظ سے کس جا قیام کرے۔ غالباً

یہی اُلجھن تصوف کے شیخِ اکبر محی الدین ابن العربی کو درپیش رہی ہو گی۔ کہتے ہیں۔ ع

العبد رب والرب عبد يا ليت شعري من المكلف
إن قلت عبد فذاك نفى أو قلت رب أنى يكلف

بندہ خدا ہے اور خدا بندہ۔ کاش میں جان لیتا ہے کہ اِن میں سے کون کس کا مواخذہ کرے گا۔ پس اگر میں کہتا ہوں کہ میں بندہ ہوں تو پھر خدا کی نفی ہو جاتی ہے اور اگر کہتا ہوں کہ خدا ہوں پھر سوچتا ہوں کہ شر اختیار کرنے کے سبب میرا مواخذہ کون کرے گا۔

اب آپ خود غور کر لیں کہ توحید کو مان لینے سے کیسے تمام تر منفی انسانی شعائر جیسا کہ ظلم، نفرت، قتل و غارت، چوری چکاری اور بے ایمانی وغیرہ وغیرہ نہ صرف جائز ہو جاتے ہیں بلکہ اِنہیں اختیار کرنا خدا کی اطاعت کے زمرے میں شمار ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک دلچسپ حل

خدا کی وحدانیت کے سبب واقع ہونے والے اِس ناگزیر مسئلہ کا حل بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ کہا جاتا ہے کہ خدا تو صرف ایک ہے یعنی خیر و شر کا بلا شرکتِ غیرے خالق لیکن خدا نے اپنے بندوں کو شر سے دور رہنے کی تلقین کر دی ہے اِس لئے اب شر اختیار کرنے پر خدا اپنے بندوں کا مواخذہ کر سکتا ہے۔ تلقین کا حکم دراصل ایک دوسرا مقدمہ ہے نہ کہ پہلے مقدمہ کا ضمیمہ۔ یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ خدا شر اختیار کرنے سے منع کرتا ہے یا نہیں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ خدا ایک ہی وقت میں خیر اور شر کا مؤجد کیسے ہو سکتا ہے؟، خدا ایک ہی وقت میں عادل اور ظالم کیسے ہو سکتا ہے؟، اگر تو ہم فہم کا اِمکان رد نہیں کرتے۔ البتہ فہم کو مسترد کر دینے کے بعد چونکہ ہم شعور سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر جس طرح کا چاہیں کلام کر سکتے ہیں یعنی کچھ جزوی تبدیلی کے ساتھ۔ ع

دیوانہ باش ہرچہ خواہد کرد

خدا کو خیر و شر کا خالق مان لینے سے چونکہ قادر مطلق مان لینا بھی لازم ہو جاتا ہے اِس لئے پھر عذر خواہی کو پیش کر کے ہم یہ بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ اَجی

خدا تو قادر مطلق ہے اُسے ہم کسی خاص صفت یا حکم کا پابند نہیں کر سکتے یعنی توحید کا سب سے بڑا مسئلہ وہی عدل کی معدومیت ہے کہ ایسی صورت میں پھر خدا پر عدل لازم نہیں ہوتا کہ وہ بہر صورت عدل اختیار کرے۔ غالباً اِسی اُلجھن کے پیشِ نظر معروف اسلامی مکتب معتزلہ نے عقیدہِ عدل قائم کیا تھا کہ خدا پر لازم ہے کہ وہ بہر صورت عدل سے کام لے۔

مسئلہِ توحید پر بحث کو ختم کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہم انسانی فہم کو سلامت رکھ کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو بہت ضروری ہے کہ ہم کلام کے دوسرے بنیادی اُصول کی اطاعت کریں اور ہر اُس فکر یا عقیدہ سے گریز کریں جس سے فہم غارت ہو۔ علاوہ ازیں بغیر منطقی بنیاد کے کچھ بھی مان لینے کی منطق اپنی اصل میں اِس قدر خطرناک ہے کہ اِسے اختیار کرنے کے بعد انسانی فہم خیر اور شر کی مسلّمہ تفریق ہی سے غافل ہو جائے گا اور یہ اپنی اصل میں ایک عظیم انسانی اَلمیہ ہو گا۔

☆☆☆☆☆

سید المجاذیب خواجہ نعمان نیئر کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں ۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری"، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نور احمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔